ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR

CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW

Vol.03 No.01 (2025)

یلدرم، پریم چند اور کرشن چندر کے افسانوں کا اشاراتی بیانیہ

A DESCRIPTIVE NARRATIVE OF THE STORIES OF YELDIRIM, PREM CHAND AND KRISHAN CHANDER

Dr. Uzma Noreen
Lecturer Department of Urdu G.C Women University Sialkot
Dr. Zonera Batool
EST Government Comprehensive Girls Higher Secondary School Faisalabad
Saddique
Lecturer Department of Urdu University of Swabi

Abstract
Urdu fiction has now been around one hundred and seventeen years old. The journey that Urdu fiction has taken during this time has been identified in the article under consideration.
There were three prominent trends in the beginning of Urdu fiction. Rashid Ul-Khairi was the pioneer of reformism, Prem Chand, realism and Sajjad Haider Yeldirim was the pioneer of romanticism. These three streams of Urdu fiction seem to us to be side by side with each other, intersect with each other and merge into each other throughout the journey. They show us their reflection in different proportions in most of the Urdu fiction writers and why not stop at Urdu fiction. These three elements make their presence known in all Urdu literature. This paper focused on the descriptive narrative in the short stories of Sajjad Haider Yeldirim, Prem Chand, Krishan Chander as well.

Key World: *Sajjad Haider Yeldirim, pioneer of romanticism, intersec, merge, Prem Chand, Krishan Chander, Rashid Ul-Khairi, Urdu literature*

ادب میں زمانے کے مزاج سے ہم آہنگی ضروری ہے کیوں کہ وہی ادب دیرپا ہوتا ہے جو زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر چلے۔ زمانے کے خیالات، رجحانات، تحریکات، نظریات اور جذبات کی ترجمانی کرنے والا ہی کامیاب ادب کہلانے کا حق دار ہو سکتا ہے۔ ادب کو زندگی کے تغیرات قبول کرنے چاہیئے۔ زمانے کا معیار اور پیمانے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان میں تغیرات کے ساتھ کلچر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ادب کو ایک وقتی جذبہ نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ ایک مستقل اور دیرپا شے ہے۔ اگر کسی تجربے یا مشاہدے کو ہم دوٹوک انداز میں پیش کریں جیسے کہ سائنس، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ تو وہ محض ایک وقتی روائیداد تو ہو سکتی ہے مگر وہ ادب نہیں ہو گا۔ اس لیے ادب ایک خاص قسم اسلوب اور حسن چاہتا ہے، اس حوالے سے محمد حسن عسکری کے خیالات یوں ہیں:

> "ادب اور فن انسانی جذبے کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ زمانہ اور ترقی کر گیا تو جذبے کی بجائے جبلت اور پھر افرادی یا اجتماعی لاشعور کا ذریعہ اظہار کہنے لگے اور اس اظہار میں طرح طرح کے نفسیاتی، معاشرتی اور تہذیبی فائدے ڈھونڈنے لگے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جذبے یا جبلت یا لاشعور کو اپنا اظہار ہی کرنا ٹھہرایا تو پھر اظہار کی ایک خاص شکل یعنی شعر و ادب یا فن یا ادب کا کوئی خاص اسلوب ہی کیوں لازمی ہے۔"(۱)

اب جب ادب کی بات کی جاتی ہے تو اس میں اشاراتی اور تشبیہاتی انداز کو اظہار کے خاص انداز میں جو شاعری میں گو زیادہ استعمال ہوتے ہیں اور ہر شاعر نے اشاراتی انداز سے کام لیا ہے۔ لیکن نثر بھی اس نظام سے خالی نہیں۔ البتہ یہ ہے کہ نثر میں اس کی مثالیں شاعری کے مقابلے میں کم ہیں۔ چند نثر نگاروں کے ہاں یہ مثالیں دیکھتے ہیں۔

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.01 (2025)

جیسے:

"یہ رنگ برنگی عورتیں مکانوں میں پکے ہوئے پھلوں کی مانند لٹکتی رہتی ہیں۔ آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر گرا سکتے ہیں۔"(۲)

منشی پریم چند کے ہاں کچھ یوں انداز پایا جاتا ہے:

"پھر میں نے گھوڑے کے اچالوں میں منہ چھپالیا۔ شتر مرغ کی طرح جو خطرے سے بچنے کی راہ نہ پا کر بالوں میں منہ چھپالیتا ہے۔"(۳)

اوپر کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نثر میں استعاراتی اور تشبیہاتی نظام اس کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ اسی طرح افسانے میں رمز و اشارہ اور ایمائیت جیسی خصوصیات سے اس کا حسن بڑھتا ہے۔ اشاراتی نظام وسیع تناظر میں استعمال ہوتا ہے۔ اشارہ تشبیہ یا استعارہ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ اشارہ میں یہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں تاریخی شعور اور گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر عام سا اور محدود دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشارہ وسیع اور ہمہ گیر ہوتا ہے۔

اشارہ میں بھی ایک خوبی ہوتی ہے کہ یہ دھندلا، غیر واضح اور مبہم ہوتا ہے اور بعض اوقات قاری اس کی تفصیل بیان کرنے اور تشریح کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ البتہ تجربہ کار اور علمیت کے گوہر والا اپنے تہذیبی اور عمرانی شعور، تجربے اور مطالعہ کی گہرائی سے اشاریت کے اندر چھپا بھید پا سکتا ہے۔ الغرض اشاریت میں پیچیدگی، باریکی اور انفرادیت ہی اس کی خصوصیات ہیں جو بمشکل ہی سمجھ آتی ہیں۔ اس طرح اشاریت میں قطعیت بھی نہیں ہوت۔ اس حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں:

"اشاریت کی بنیادی مشکل یہ ہے کہ اسے کسی نقشے یا خاکے میں محدود نہیں کر سکتے۔ اس لیے یہ علامتیں آسانی سے گرفت میں آجاتی ہیں جن میں نیم تاریخیت ہو۔ نیم تاریخیت سے مراد یہ ہے کہ وہ شے یا واقعہ جو علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے اپنی جگہ پر اس قدر مشہور اور مستحکم ہو کہ وہ تاریخ سے زیادہ قوی طور پر ذہنوں میں جاگزیں ہو لیکن اس کی تاریخی اصل واضح نہ ہو۔"(۴)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مخصوص دور میں تخلیق ہونے والے اشارے اُسی دور کے لیے خاص ہو سکتے ہیں۔ بعد ایک مدت کے اُن کی ضرورت واہمیت کمزور پڑ جاتی ہے۔ مثلاً ہم کبوتر کی مثال لے لیں تو یہ پرانے زمانے میں امن کی علامت گردانا جاتا تھا۔ لوگ کبوتر کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ امن کا پیغام پہنچاتے تھے۔ اسی طرح کبوتر کے نظر آتے ہی جنگ کی بجائے امن کی شروعات ہو جاتی تھیں۔ اسی طرح اگر عیسائی مذہب کا مطالعہ کریں تو "صلیب" ان میں مذہبی علامت کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

اشارہ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ فرائیڈ کے مطابق اشارہ کی دو اقسام ہیں:

۱۔ عارضی ۲۔ دائمی۔

عارضی اشاروں کی نوعیت مستقل نہیں ہوتی اور وہ ایک خاص وقت میں پیدا ہو کر وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں جب کہ دائمی اشارے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت نہیں کھوتے۔ فرائیڈ کے مطابق "سانپ" مردانہ عضوئے خاص کی مستقل علامت ہے۔

فرائیڈ کے علاوہ دیگر ناقدین کی نظر میں اشارے کی مزید اقسام ہیں۔ ایک اور قسم بھی ہے جس کو نجی یا شخصی اشارہ کہتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی کہانی کار اپنی تخلیق میں اپنے شخصی تجربے کی وجہ سے اپنا ایک مخصوص اشارہ ایجاد کر لیتا ہے جو صرف اُس کی ذات کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی خاص جگہ، درخت، پہاڑ، چوک، کھیت، حجرہ، بیٹھک وغیرہ۔ مخصوص جگہ تخلیق کار کے ماضی کی خوش گوار یا تلخ یادوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور اس طرح اس کے معنی قاری پر واضح ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ نجی یا شخصی اشارے کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں ہوتے لیکن اُس خاص تخلیق کار کے حوالے سے خاصے کی چیز بن جاتے ہیں۔

اشاروں ک مستقل دو اقسام ہوتی ہیں۔ ۱۔ روایتی ۲۔ آفاقی۔

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.01 (2025)

۱۔ روایتی اشاروں میں وہ میراث شامل ہوتی ہے جو عموماً ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ جیسے اردو شعر و ادب میں گل، بلبل، چاند، دھرتی، ستارے، ساقی، مے خانے، صحرا وغیرہ۔

۲۔ آفاقی اشارے وہ ہیں جو مجموعی طور پر کسی بھی قوم یا ملت کے تہذیبی و تمدنی اثرات کو اپنے اندر رکھنے کی مخصوص پہچان ہوتے ہیں۔ مثلاً "صلیب"، "ہلال" وغیرہ۔

جب ہم اردو افسانے کے اشاراتی نظام پر نظر ڈالتے ہیں تو ان اشاروں کے مخصوص اسلوب ہوتے ہی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ چند اشاروں کو جمع کیا جائے بلکہ ان کے معنی کائنات کو روشن کرتے ہیں۔ مثلاً جس لفظ یا چیز کو اشاراتی رنگ عطا کیا جاتا ہے وہ اپنے منطقی معنی کے علاوہ ایک خاص تہذیب، تاریخ اور ایک خاص پس منظر کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کی تلمیح، قدیم داستان، قدیم روایتی قصہ یا مذہبی قصہ شامل ہوتے ہیں۔ کبھی اس میں ایک Ayth بھی شامل ہو جاتی ہے تو کبھی بچوں کی مخصوص علامتی کہانیاں شامل کی جاتی ہیں۔ اس کا مطلب ماضی پرستی یا کہنہ سوایاح کو زندہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ ماضی کی روشنی میں حال کو زندہ رکھنا ہوتا ہے۔

جب اردو افسانے کی روایت پر نظر ڈالتے ہیں تو سجاد حیدر یلدرم سے لے کر موجودہ جدید افسانے ایک خاص اشاراتی نظام وقوع پذیر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

اشاریت کہیں واضح اور کہیں غیر واضح ہوتی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے جو ترکی افسانوں کے تراجم کے ساتھ چند طبع زاد کہانیاں بھی لکھیں۔ ان کے مجموعے "خیالستان" میں شامل افسانے "ثریا چڑے کی کہانی" میں چڑیا اور چڑے کے درمیان ایک طویل مکالمہ ہے جس کا مقصد سماجی جذبہ مساوات عورت سے مرد کی بے وفائی، ریاکاری، منافقت اور دیگر سماجی برائیوں کے حوالے سے مراد کو سامنے لایا ہے۔ چڑا خود کو آزاد، بے ضرر اور انصاف پسند سمجھتا ہے۔ وہ بلبل کو دل آویز گانے کی وجہ سے پسند نہیں کرتا۔ دوسرا یہ کہ کبوتر کاہل اور حریت ناشناس ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> "میں اڑتا ہوں، پھدکتا ہوں، دانے چگتا ہوں، مگر الحمد اللہ کسی کو آواز نہیں دیتا۔ خدا کی زمین سب کے لیے اور اس کے دانے سب کے لیے ہیں۔ یہ فلسفہ قدرت نے مجھے سمجھا دیا ہے اور اس لیے میں سب سے کہتا ہوں کہ آؤ اور کھاؤ اور خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ جہاں بہت سے دانے ہوئے اور ہم اپنے تمام ہم جنسوں کے ساتھ پہنچے۔ پھر وہاں اگر اور مخلوق چگ رہی ہو تو میں معترض ہوتا۔ کبوتر ہو، مینائیں ہوں، فاختائیں ہوں، سب کو صدائے عام ہے۔ سب ساتھ آئیں اور کھائیں۔ تنہا خوری میری عادت نہیں۔"(۵)

چوں کہ مرد ہمیشہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے عورت کو رام کرتا ہے اور بہکاتا ہے۔ پھر اپنا مطلب نکلنے کے بعد آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ اس کو چڑے نے کس طرح بیان کیا ہے:

> "یہ ایسا منظر تھا کہ شروع شروع میں اس سے بہت متاثر ہوتا تھا لیکن میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی انسان چڑا دوسرے دن دوسرے گھونسلے میں دوسری چڑیا سے پہلی چڑیا کی نظروں سے دور کہہ رہا ہے: آہ میں تمہیں چاہتا ہوں، تمہارے سوا حور بھی ہو تو اس پر آنکھ نہ ڈالوں گا اور یہ بیچاری معصوم چڑیا بھی اس دھوکے باز چڑے کے پھندے میں پھنس جاتی ہے اور اپنا محبت بھرا دل اس کے سپرد کر دیتی ہے۔ تیسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ وہی چڑا ایک اور گھونسلے میں ایک تیسری چڑیا سے کہہ رہا ہوں، "آہ میں تمہیں چاہتا ہوں، تمہارے سوا حور بھی ہو تو اس پر آنکھ نہ ڈالوں (۶)"۔

سجاد حیدر یلدرم کے دیگر افسانوں "خارستان و گلشن" میں بھی عورت اور مرد کی جنس کے حوالے سے لطیف اشارے کیے ہیں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے سے الگ الگ ماحول اور ایک دوسرے سے واقف ہوئے بغیر جب بھی سامنے آتے ہیں تو جنسی جبلت انھیں ہم آغوش کراتی ہے۔ کیوں کہ جنس ایک ایسی جبلت ہے تو جو دبانے سے مزید ابھرتی ہے۔ مثلاً خارا اور نسرین نوش ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں تو کیسے انھیں ایک دوسرے کی ضرورت پڑتی

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.01 (2025)

ہے۔ نسرین ایک خوابیدہ ماحول میں ہوتے ہوئے بھی مرد کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ اسی طرح خارا کی بھی ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے۔ اس طرح خارا جب نسرین نوش کے جزیرے میں پھنس جاتا ہے اور نسرین نوش سے جسمانی طور پر قریب ہو جاتا ہے تو منظر یوں بن جاتا ہے:

"نسرین نوش کا نرم ریشمی لباس بارہ سنگھے کی کھال کے کپڑوں میں جسے خارا پہنے ہوئے تھا پھنس گیا۔ دونوں نے اسے چھپانا چاہا مگر دیکھتے کیا ہیں کہ ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں ہے اور ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو محبت سے دبا رہا ہے۔۔۔۔۔

ان دونوں کی روحیوں ایک مبہم شوق کے ساتھ ایک دوسرے سے ملیں اور اس دفعہ دونوں کی آنکھوں میں سے ایک جان فروز چمک، ایک دل سوز چنگاری نکلی، موجیں ساحل کی طرف کیسے آتی ہیں۔؟ آفتاب کائنات پر کس طرح روشنی ڈالتا ہے؟ شہد کی مکھی کس طرح پھولوں کی طرف جاتی ہے؟ بس بالکل اسی طرح ان دو بیگانہ روح آشنا کے ہونٹ، ایک قدرتی کشش، ایک قدرتی شوق کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے۔ جزیدہ گو بے انتہا خوب صورت تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک گراں خواب میں سو رہا ہے اور ہمیشہ سے کسی چیز کا انتظار کر رہا ہے۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کا بوسہ لینا تھا کہ جزیرے کے پرندے چہچہا کر اڑنے لگے، تمام کلیاں ایک دم کھل گئیں۔"(۷)

پریم چند کے افسانے "کفن" میں عصر حاضر کے حوالے سے طنزیہ اشاریت سے کام لیا گیا ہے۔ جب گھسو اور مادھو جیسے کام چور چمار جو خاصے نکمے ہیں۔ پچھلے سال ہی مادھو کی شادی ہو گئی تھی اور اس کی بیوی بدھیا اندر کمرے میں دروازہ سے چلا رہی ہے لیکن یہ دونوں اس وجہ سے اندر نہیں جاتے کہ کہیں دوسرا آلو زیادہ نہ کھائے۔ بدھیا بالآخر مر جاتی ہے اور یہ دونوں اس کی لاش پر کاروبار کر کے مزید بے عزتی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یوں کچھ پیسے ہاتھ آجائیں تو اس سے شراب خرید کر پینے لگتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ وہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی اندر جا کر تڑپتی ہوئی عورت کو دیکھنے تیار نہیں کیوں کہ مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھڑی میں گیا تو گھسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔"(۸)

اس افسانے کے حوالے سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"پوری کہانی کی جان وہ ستم ظریفی ہے جس نے انسان کو انسان نہیں رہنے دیا اور اسے *Debase* اور *Dehumanise* کر دیا ہے۔ "کفن" کے فنی کمال اور اس کی معنویت کا نقش ابھارنے کے لیے اس تمثیلی طور پر نہیں بلکہ *Irony* کی سطح پر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ *Irony* میں لفظوں کے وہ معنی نہیں ہوتے جو بادی النظر میں دکھائی دیتے ہیں۔"(۹)

کرشن چند کے ہاں بھی اشاراتی انداز پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں "دو فرلانگ لمبی سڑک"، "گڑھا" اور "بائیں بازو کی چوری" میں اشاراتی انداز پایا جاتا ہے۔ ان میں سے "دو فرلانگ لمبی سڑک" میں ہندوستانی معاشرے کی غلامیانہ ذہنیت کے حوالے سے خاصے بلیغ اشارے موجود ہیں۔ سارا معاشرہ جاہلوں سے بھرا ہوا ہے۔ کوئی کسی کی بات نہیں سنتا نہ دھیان دیتا ہے۔ ساری سڑک پر جاہلوں کا ڈیرا ہے۔ ہر روز نئے تماشے ہوتے ہیں لیکن کوئی بھی اپنی روش سے نہیں ہٹتا اس حوالے سے ذیل کا اقتباس دیکھیے:

"سڑک کے دورویہ شیشم کے سوکھے سوکھے اداس سے درخت کھڑے ہیں۔ ان میں نہ حسن ہے، نہ چھاؤں، سخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گِدھوں کے جھنڈ۔"(۱۰)

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.01 (2025)

شیشم کے سوکھے درختوں کا یہ اشارہ ہے کہ یہ درخت بھی کبھی ہرے بھرے اور تازہ تھے۔ مثلاً یہ معاشرہ بھی کبھی ہلچل اور گرما گرمی سے بھرا ہوا تھا تو یہی معاشرہ اب تنزل کا شکار ہے۔ یعنی شیشم کے درخت سوکھ چکے ہیں۔ سڑک پر شیشم کے درختوں پر گدھ وہ بے حس طبقہ ہے جو معاشرے کے تنزل پر خاموش تماشائی بن کر بیٹھا ہوا ہے۔ ایک اور اقتباس دیکھیں:

"اس کا رنگ کبھی نہیں بدلتا۔ اس کی ہئیت میں تبدیلی نہیں آئی۔ اس کی صورت میں روکھا پن بدستور موجود ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔"(۱۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرہ اپنی پرانی روش پر قائم ہے اور اسے اپنی تنزلی پر کوئی شرمندگی نہیں۔ مطلب معاشرہ ابھی تک بیدار نہیں ہوا اور نہ ہی اسے پرواہ ہے۔ معاشرہ بے حس ہو جائے تو یہی حال ہو جاتا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان تین افسانہ نگاروں کے ہاں اشاراتی نظام کی لہریں واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسن عسکری، ادب اور فن، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۰

۲۔ سعادت حسن منٹو، منٹو راما، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۲

۳۔ پریم چند، پریم چند کے بہترین افسانے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۳۰

۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی، افسانے کی حمایت، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۰

۵۔ سجاد حیدر یلدرم، مجموعہ سجاد حیدر یلدرم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۵

۶۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۷۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۸۔ پریم چند، پریم چند کے بہترین افسانے، ص ۴۷

۹۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ، روایت اور مسائل، مکتبہ عالیہ ل، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۱۵۰

۱۰۔ کرشن چندر، طلسم خیال، مکتبہ علم و عرفان، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۶۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶۸